بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نظرات

مجلس دار المصنفین اعظم گڑھ (ہند) کے ماہوار علمی رسالہ "معارف" نے اپنے مارچ ۱۹۶۸ء کے شمارے میں ادارہ تحقیقات اسلامی پر اظہار خیال کیا ہے، اور من جملہ اور باتوں کے ادارہ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے بارے میں لکھا ہے:- "...... ان کا انداز فکر سراسر مغربی ہے۔ ان کے اجتہادات محض فقہی مسائل تک محدود نہیں بلکہ انھوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر اسلام کی اساس کتاب وسنت اور وحی والہام پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا ہے..." یہ لکھنے کے بعد "معارف" نے پاکستان کے "صاحب علم ونظر علماء" سے اپیل کی ہے کہ ان کی دینی جماعتوں" کا زور قلم ایک دوسرے کے مقابلہ میں صرف ہونے کے بجائے اصل فتنوں کے سدّباب میں صرف ہونا چاہیئے، ورنہ ان جماعتوں کو نقصان پہنچنے کے ساتھ دین کو بھی نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔"

بے شک پرانی راہوں پر چلنے کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ ان پر چلنے والے ہر غلطی سے محفوظ رہتے ہیں، کیونکہ اگر کوئی غلطی ہوتی ہے، تو وہ ان کی نہیں ہوتی، بلکہ پہلوں کی ہوتی ہے اور اسے یہ کہہ کر بآسانی ٹال دیا جاتا ہے کہ "ھذا ما وجدنا علیہ اباءنا" لیکن جب حالات وضروریات نئی راہیں نکالنے پر مجبور کر دیں، ان پر قدم اٹھائے بغیر کوئی چارہ نہ رہے اور سامنے صرف یہ دو متبادل ہوں کہ یا تو لکیر کے فقیر بن کر کاروانِ تاریخ کے گرد راہ بن کر رہ جاؤ۔ یا نئی راہوں پر قدم بڑھاؤ۔ اور اس کی پروا نہ کرو کہ تمہارا کوئی قدم اِدھر اُدھر پڑتا ہے۔ کیونکہ لوگ ٹھوکریں کھاتے ہیں اور سنبھل جاتے ہیں، غلطیاں کرتے ہیں اور بعد میں ان کی اصلاح کر لیتے ہیں۔ غرض جب یہ صورت حال ہو تو نئی راہوں پر گامزن ہونا ہی پڑتا ہے۔ یہ ضرورت تھی جس کے تحت ادارہ تحقیقات اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اور وہ

اسی کو پورا کرنے کے لئے بساط بھر کوشش کر رہا ہے۔

یقیناً بعض نئے اقتصادی و معاشرتی مسائل پر، جن سے آج مسلمانوں کو سابقہ پڑ رہا ہے، ادارہ کو سوچ بچار کرنی پڑی اور ان کے بارے میں اُس نے اپنی رائے دی۔ اسی طرح بہت سے ایسے علمی و فکری مسائل ہیں، جنہیں جدید علوم و فنون اور ان سے پیدا ہونے والی ہمہ گیر اثر و نفوذ رکھنے والی تہذیب نے جنم دیا ہے اور جو آج ہر باشعور مسلمان کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنی کتابوں میں ان مسائل پر بحث کی ہے۔ اور اپنا اور صرف اپنا نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔ اُن کی اِن آراء میں سُقم ہو سکتے ہیں۔ ان پر تنقید ہو سکتی ہے اور ضرور ہونی چاہیئے، لیکن "معارف" نے جس انداز میں اور جس لہجہ میں ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اور اس کے ڈائرکٹر کا ذکر کیا ہے اور "دینی جماعتوں کے اصحاب علم و قلم" کو باطل کے مقابلے میں متحد ہونے کی دعوت دی ہے، ہم اس بارے میں کچھ معروضات کرنا چاہتے ہیں۔

دار المصنّفین اعظم گڑھ کی علمی و اسلامی خدمات سے ہمیں انکار نہیں اور ان کے اعتراف و اثبات سے ہمیں ایک دلی مسرّت ہوتی ہے۔ دار المصنّفین نے سیرت نبوی، تاریخ صحابہ و تابعین و تبع تابعین اور عام تاریخ اسلامی کو روایتی اور مقبول عوام اسلوب میں پیش کر کے برّصغیر کے مسلمانوں کو بہت کچھ دیا ہے اور اس کا یہ احسان ناقابل فراموش ہے۔ لیکن ہم یہ عرض کریں گے کہ اُس کی اِس خدمتِ اسلامی کا ایک محدود دائرہ ہے، اور اُس نے جہاں شبلیؒ کے نام نامی کو زندہ رکھا، وہاں اس کے ساتھ اس دار المصنفین نے اُس شبلیؒ کو جو الغزالی، مولانا روم، النعمان، المامون اور بالخصوص علم الکلام اور الکلام کا مصنف تھا، گوشۂ گمنامی میں پھینک دیا، اور بجائے اس کے کہ دار المصنفین شبلیؒ کی اس نئی راہ کو جو واقعی نئی تھی، اور اُس زمانے میں جب شبلیؒ نے یہ کتابیں لکھیں، کہیں زیادہ نئی تھیں، بہ نسبت ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی آج کی راہ سے، اور آگے بڑھاتا اور اس پر چلتا، اس نے رجعت قہقری اختیار کی اور ان سب فکری اختراعات سے رجوع کر لیا، جو شبلیؒ کی سب سے بڑی علمی و فکری متاع تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم و مغفور ساری عمر تفریح اور تجدد کے خلاف رزم آرا رہے۔ اور آخر میں شبلیؒ کے مقصدِ اقدام و تجدید و تخلیق کو یکسر بھلا کر وابستۂ نظام خانقاہی ہو گئے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے اور شبلیؒ کے ساتھ یہ کتنا بڑا ظلم ہے اُس

سے انتساب رکھنے والوں کا۔

"معارف" کا ادارہ تحقیقات اسلامی پر یہ "ہجوم عمومی" دراصل اسی ذہنیت کی ترجمانی کرتا ہے جو بدقسمتی سے پہلے سے بھی زیادہ راسخ ہوتی جارہی ہے۔

یہ کیوں ہوا؟ اس کے بھی اپنے اسباب ہیں۔ عوام کا مرجع بننا بڑا دل کش ہوتا ہے اور عوام میں اپنی ہر دلعزیزی کو تج دینا افراد کے لئے بڑا مشکل اور اداروں کی کامیابی کے لئے انتہائی سنگ گراں ہوتا ہے۔ دار المصنّفین نے شبلیؒ کے بعد جو راہ اختیار کی، وہ آسان بھی تھی اور عوام میں مقبولیت کی ضامن بھی۔ اس بارے میں کسی آئندہ موقع پر تفصیل سے عرض کیا جائے گا۔

بے شک ادارہ تحقیقات اسلامی کی اپنی علم و فکر کی خام کاریاں ہیں اور عمل کی کوتاہیاں بھی۔ اور "اس کی تحقیقات" اور "اس کے ڈائرکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے اجتہادات" میں لغزشوں اور غلطیوں کا پورا امکان ہے، لیکن "معارف" کے شذرات نگار نے یہ جو لکھا ہے کہ "ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے اجتہادات محض فقہی مسائل تک محدود نہیں، بلکہ انھوں نے اس سے بھی آگے بڑھ کر اسلام کی اساس کتاب و سنت اور وحی و الہام پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا ہے . . . ." اگر مولانا شبلیؒ کی کتابیں "علم الکلام" اور "الکلام" ہیں لکھا ہوا مصنف کے ذہن کے کسی گوشے میں ہوتا، تو اس طرح کی زبان و لہجہ میں یہ اعتراض کبھی نہ کرتے۔

مثال کے طور پر "علم الکلام" کے صفحہ ۱۱۴ - ۱۱۵ پر مولانا شبلیؒ نے شاہ ولی اللہ کا ذکر کیا ہے اور ان کی تصوّرِ عالم مثال پر بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ " . . . . حضرت مریم نے جو حضرت جبرئیل کو دیکھا تھا اور حضرت جبرئیل جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تھے، قبر میں جو فرشتے آتے ہیں . . . . ان سب کو شاہ صاحب اسی عالم (مثال) میں داخل کرتے ہیں، پھر لکھتے ہیں کہ اس قسم کے جو واقعات احادیث میں منقول ہیں، ان کے متعلق تین رائیں قرار پا سکتی ہیں۔"

شاہ صاحب کی ان آراء کو مولانا شبلی یوں بیان کرتے ہیں:-

"یا تو ان کو ظاہری معنوں پر محمول کیا جائے۔ اس صورت میں عالم مثال کا قائل ہونا پڑے گا۔ جیسا کہ ہم نے تسلیم کیا ہے . . . . یا اگر عالم مثال نہ مانا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ یہ واقعات اس شخص

کو اسی طرح معلوم ہوتے ہیں، اگو وہ خارج میں نہیں ہوتے ۔ ۔ ۔ ۔ تیسرا احتمال یہ ہے کہ ان احادیث و واقعات کو تمثیل قرار دیا جائے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ جو شخص محض تیسرے احتمال کو مانتا ہے، میں اس کو اہل حق میں سے نہیں سمجھتا۔"

شاہ صاحب کے اس کلام پر خود مولانا شبلیؒ کا تبصرہ یہ ہے:۔

"تیسرے احتمال کو تو شاہ صاحب جائز نہیں رکھتے، لیکن دو پہلے احتمالوں کو جن میں سے ایک کو وہ اہل حدیث کے اصول کے موافق قرار دیتے ہیں، اگر اور مذہبی علماء بھی تسلیم کرلیں تو فلسفہ اور مذہب میں کسی قسم کی نزاع باقی نہیں رہتی۔ فلسفہ خود بڑھ کر کہے گا۔ ع

بیا کہ نیست مرا با تو ماجرا حافظ"!

"علم الکلام" ہی میں ایک باب "حکمائے اسلام" ہے۔ اس میں نبوت، ملائکہ اور وحی کے متعلق ان کے اقوال ہیں۔ بقول مولانا شبلیؒ، فارابی کے نزدیک "ملائکہ صُور علمیہ کا نام ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ادراک کے وقت صاحبِ قوۃ قدسیہ کی باطنی اور ظاہر حس اوپر کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اور اس وقت فرشتہ مجسم صورت میں نظر آتا ہے۔ اس حالت میں صاحبِ قوۃ قدسیہ اس کی آواز بھی سنتا ہے۔ اور یہ آواز وحی ہوتی ہے، لیکن یہ صورت اور یہ آواز دونوں اضافی چیزیں ہیں۔" اور وحی کے بارے میں فارابی کی رائے یہ ہے:۔ "فرشتہ کو براہ راست روح سے اتصال ہوتا ہے اور فرشتہ کا مافی الضمیر روح پر اس طرح پَرتو ڈالتا ہے جس طرح آفتاب پانی میں۔ اس اتصال کی حالت میں فرشتہ کی مثالی صورت اور آواز صاحب قوۃ قدسیہ کو محسوس ہوتی ہے ۔ ۔ ۔"

اس سے آگے مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ ابن مسکویہ نے بھی وجود باری، نبوت اور وحی پر بحث کی ہے۔ اس کے نزدیک جمادات ترقی کر کے نباتات کے درجے میں آئے، نباتات نے ترقی کی اور حیوانات کے درجے میں آئے۔ پھر انسانیت کا آغاز ہوا۔" یہی ترقی کا سلسلہ خود انسان کے نوع میں قائم ہے۔ یہاں تک کہ قوائے عقلیہ، ذہن، ذکاء، صفائی باطن اور پاکیزہ خوئی میں ترقی کرتے کرتے انسان ملکوتیت کی حد تک پہنچ جاتا ہے۔ یہی مرتبہ ہے جس کو ہم نبوت اور رسالت سے تعبیر کرتے ہیں۔"

"وحی کی حقیقت" کے عنوان کے تحت مولانا شبلی نے ابن مسکویہ کی یہ رائے درج کی ہے:۔ "انسان کے قوائے ادراکی کی ترقی اس طرح درجہ بدرجہ ہوتی ہے کہ پہلے وہ محسوسات کا ادراک کرتا ہے۔ پھر محسوسات

سے تخیل، تخیل سے فکر اور فکر سے عقلیات محضہ کے ادراک تک پہنچتا ہے۔ لیکن جب انسان اس مرتبہ تک ترقی کرتا ہے جس کو اوپر ہم نے نبوت کے درجہ سے تعبیر کیا ہے تو اس کو معلومات اور حقائق کے ادراک میں تدریجی ترقی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ اس کو ابتداً حقائق اشیاء کا ادراک ہو جاتا ہے۔ یعنی جو بات اور لوگوں کو جزئیات کے استقراء اور محسوسات کی تجرید اور مقدمات کی ترتیب سے معلوم ہوتی ہے، وہ پیغمبر کو ابتداً بغیر غور و فکر کے القا ہو جاتی ہے، اسی کو وحی یا الہام کہتے ہیں۔" اور ابن مسکویہ یہ بھی کہتا ہے :۔ "نبی کبھی کبھی معقولات سے محسوسات کی طرف آتا ہے۔ . . . جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ مفہوم جو عقلی اور مجرد عن المادہ تھا، مجسم ہو کر محسوس ہوتا ہے بعینہٖ اس طرح جس طرح نیند میں قوت متخیلہ کے ذریعہ سے انسان کو محسوس صورتیں نظر آتی ہیں۔ یا وہ محسوس آوازیں سنتا ہے۔"

یہ ذکر کرنے کے بعد مولانا شبلی لکھتے ہیں :۔ علامہ ابن مسکویہ نے وحی اور مشاہدات اور مسموعات انبیاء کی جو حقیقت بیان کی، امام غزالی نے کتاب "المضنون بہ علی غیر اھلہ" میں بعینہٖ اس کو اپنے الفاظ میں ادا کیا ہے۔" اس پر وہ یہ اضافہ کرتے ہیں :۔ "لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ وحی اور مشاہدہ کی یہ حقیقت صرف حکماء کا مذہب ہے۔ علمائے ظاہر کے نزدیک یہ قول بالکل کفر میں داخل ہے۔"

اسی سلسلے میں مولانا شبلی اور حکمائے اسلام کے اسی طرح کے اقوال نقل کرتے چلے گئے ہیں اور کہیں اشارہ نہیں کیا کہ انھوں نے "وحی و الہام پر ہاتھ صاف کر دیا ہے"۔ البتہ آخر میں صرف اتنا لکھا ہے" :۔ کیا عجیب بات ہے کہ یہی خیالات کسی کے نزدیک کفر ہیں اور کسی کے نزدیک حقائق و اسرار . . . "۔

کتاب "الکلام" میں ایک باب ہے " انبیاء کی تعلیم و ہدایت کا طریقہ"۔ اس میں مولانا شبلی لکھتے ہیں :۔ "مذہب کے متعلق بہت بڑی غلطی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ لوگ انبیاء کے اصول طریقہ تعلیم کو ملحوظ نہیں رکھتے . . . لیکن امام رازی نے مطالب عالیہ میں، ابن رشد نے کشف الادلہ میں اور شاہ ولی اللہ صاحب نے حجتہ اللہ البالغہ میں تفصیل کے ساتھ یہ اصول بیان کیے ہیں۔"

بعد ازاں مولانا نے حجتہ اللہ البالغہ سے چند ایک اصول ذکر کیے ہیں۔ پہلا اصول یہ کہ انبیاء کو اگرچہ عوام و خواص دونوں کی ہدایت مقصود ہوتی ہے، لیکن چونکہ عوام کے مقابلہ میں خواص کی تعداد اقل قلیل ہوتی ہے۔ اس لیے ان کی طرز تعلیم اور طریقہ ہدایت میں عوام کا پہلو زیادہ ملحوظ ہوتا ہے۔ البتہ

ہر جگہ ضمن میں ایسے الفاظ موجود ہوتے ہیں، جن سے اصل حقیقت کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اور جس کے مخاطب خواص ہوتے ہیں۔ دوسرا اصول۔ انبیاء لوگوں کی عقل وعلم کے لحاظ سے ان سے خطاب کرتے ہیں، لیکن اس علم وعقل کے لحاظ سے جو اکثر افراد انسانی میں پائی جاتی ہے۔ تیسرا اصول۔ انبیاء تہذیب اخلاق اور تزکیہ نفس کے سوا اور قسم کے مسائل اور مباحث اور حقائق سے متعرض نہیں ہوتے اور اس قسم کے امور کے متعلق جو کچھ بیان کرتے ہیں، تو انہی کی روایات اور خیالات کے مطابق۔ اور اس میں بھی استعارات اور مجازات سے کام لیتے ہیں۔ چوتھا اصول یہ کہ انبیاء جس قوم میں مبعوث ہوتے ہیں، اس کے اکل وشرب، لباس مکان، سامان آرائش، طریقہ نکاح زوجین کے عادات، بیع وشرا، معاصی پر دار وگیر، فصل قضایا، غرض اس قسم کے تمام امور پر نظر ڈالتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں ویسی ہی ہیں، جیسا اُن کو ہونا چاہیئے تو پھر کسی قسم کا تغیر وتبدل نہیں کرتے، بلکہ ترغیب دلاتے ہیں کہ یہ رسوم وآئین صحیح اور واجب العمل اور مبنی علی المصالح ہیں۔ البتہ اگر ان میں کچھ نقص ہوتا ہے . . . . تو ان کو بدل دیتے ہیں۔ وہ بھی اس طرح نہیں کہ سرے سے انقلاب کر دیں، بلکہ اس قسم کی تبدیلی کرتے ہیں کہ جن کے مشابہ کوئی چیز قوم میں پہلے سے موجود ہوتی ہے۔ یا اُن لوگوں کے حالات میں اس کی مثالیں پائی جاتی ہیں، جن کو قوم اپنا مقتدا اور پیشوا تسلیم کرتی آتی ہے۔

اور پانچواں اصول یہ ہے کہ انبیاء پر جو شریعت نازل ہوتی ہے، اس کے دو حصے ہوتے ہیں۔ ایک وہ عقائد ومسائل جو مذہب کے اصول کلیہ ہوتے ہیں۔ اس حصے میں تمام شریعتیں متحد ہوتی ہیں . . . . . دوسرے وہ احکام اور سنن جو خاص خاص انبیاء کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور جن کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ شریعت موسوی مثلاً شریعت عیسوی سے مختلف ہے۔ شریعت کا یہ حصہ خاص خاص قوموں یا ملکوں کے مصالح اور فوائد پر مبنی ہوتا ہے۔ اور اس کی بنیاد زیادہ تر ان خیالات، عقائد، عادات، معاملات، رسوم، طریق معاشرت اور اصول تمدن پر ہوتی ہے جو پہلے سے اس قوم میں موجود تھے۔

مولانا شبلیؒ نے اس اصول کی وضاحت شاہ صاحب کے متعدد اقتباسات سے کی ہے۔ ایک اقتباس کی طویل عبارت کا ایک ٹکڑا یہ ہے:۔ ”. . . . یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ہر قوم یا ہر پیشوائے قوم کو اجازت دے دی جائے کہ وہ اپنی شریعت بنالیں . . . نہ یہ ہو سکتا ہے کہ ہر قوم کی عادات اور خصوصیات کا تجسس کیا جائے۔ اور ہر ایک کے لئے الگ الگ شریعت بنائی جائے۔ اس بنا پر اس سے بہتر اور آسان کوئی اور طریقہ نہیں کہ

شعائر، تعزیرات اور انتظامات میں خاص اس قوم کی عادات کا لحاظ کیا جائے، جن میں یہ امام پیدا ہو۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر ان احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔"

شاہ صاحب کی یہ عبارت نقل کرنے کے بعد مولانا شبلی فرماتے ہیں :۔

"اس اصول سے یہ بات ظاہر ہو گی کہ شریعت اسلامی میں چوری، زنا، قتل وغیرہ کی جو سزائیں مقرر کی گئی ہیں، ان میں کہاں تک عرب کے رسم و رواج کا لحاظ رکھا گیا ہے، اور یہ کہ ان سزاؤں کا بعینہا اور بخصوصہا پابند رہنا کہاں تک ضروری ہے۔"

مولانا شبلی نے اپنی ان دونوں کتابوں میں معتزلہ اور حکمائے اسلام کے ان خیالات کی کہیں بھی نکیر نہیں کی۔ بلکہ معتزلہ کے ذکر میں تو ہر جگہ تعریف کا پہلو نکلتا ہے۔ اور ایک حد تک تعریض ہے تو محدثین اور فقہاء کی۔ "علم الکلام" کے شروع ہی میں لکھا ہے :۔ محدثین اور فقہاء اپنے ہم مذہبوں کے سوا کسی اور مذہب والے سے ملتے نہ تھے..... اور ان کو مطلق خبر نہیں ہوتی تھی کہ اسلام پر کیا اعتراضات کئے جا رہے ہیں۔ ان کا خطاب صرف اپنے معتقدین کے گروہ سے ہوتا تھا اور وہ ان سے جو کچھ کہہ دیتے تھے، وہ لوگ بغیر کسی عذر کے قبول کر لیتے تھے.... بخلاف اس کے متکلمین اور خصوصاً معتزلہ ہر مذہب اور ہر فرقہ کے لوگوں سے ملتے تھے اور ان سے مناظرہ و مباحثہ کرتے تھے...."

یہ جو کچھ اوپر لکھا گیا ہے، اس کے بعد اگر ہم یہ دعویٰ کریں کہ مولانا شبلی نے اپنے عہد میں اور خاص کر "علم الکلام" اور "الکلام" لکھ کر اسلام کے تمام عقائد کو فلسفہ حال کے مقابلے میں نہایت بسط اور خوبی کے ساتھ ثابت کرنے کی جو طرح ڈالی تھی، ادارہ تحقیقات اسلامی پچاس سال بعد اسی کو اور آگے بڑھانا چاہتا ہے، تو بے جا نہ ہوگا۔ گو اپنی علمی بے بضاعتی کا ہمیں احساس ہے۔ لیکن کچھ بعید نہیں کہ ہم سے زیادہ اہل اس کام کا بیڑا اٹھالیں اور ان کے ہاتھوں یہ تکمیل کو پہنچے، بہر حال کرنے کا کام یہی ہے، اور حضرت شاہ ولی اللہ، مولانا محمد قاسم، سرسید، مولانا شبلی اور مولانا عبیداللہ سندھی جس قافلے کے سالار تھے، اس کے پیچھے چلنے کی طلب اور کوشش اس ادارہ کی ہے۔